بیان الحکمہ
تحقیقی مجلہ۔5
http://bayan-ul-hikmah.salu.edu.pk

بیان الحکمہ [تحقیقی مجلہ]
27-42 (2019ء)

*ڈاکٹر سجاد علی استوری

ڈاکٹر علی شریعتی کا تصور امامت و خلافت کا ایک تنقیدی جائزہ

ABSTRACT: The word excommunication means to exclude a Muslim from prescribed boundary of Islam.non of us have the authority of excommunicated any one from Islam except Allah almighty and his beloved prophet Mohammad (PBUH).because the act of excluding a Muslim, belongs to the orders of Allah (the foundation of Which is Quran) and Sunnah therefore drastic care should be taken in this regard and the one and only would be called as disbeliever if confirmed in the light Quran and Sunnah. Basically any Muslim will be called as Muslim until and unless he is acting openly upon the rules and regulation of Islam. A Muslim would be considered as disbeliever if proclaimed blasphemy intestinally.

کلیدی الفاظ: عصمت، امامت، خلافت، ناس، شعوریت

* اسسٹنٹ پروفیسر، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور، سندھ۔

مقدمہ

ڈاکٹر شریعتی اس صدی کے جدت پسند اور انقلابی دانشور گزرے ہیں۔ علامہ محمد اقبال لاہوری کی طرح ڈاکٹر علی شریعتی بھی مغربی ممالک سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے بعد مغربی اقدار و ثقافت سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اسلامی اقدار کو ہی انسانیت کیلئے نجات اور کامیابی کے ضامن سمجھا البتہ دوسری طرف انہوں نے اسلامی نظریات کے منجمد نظریات کو متحرک اور زندہ کرنے کے علاوہ اس کی ایک نئی عالمگیر اور آفاقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی اور رسمی اور مقید حدود سے اسلامی تصور کو نکال کر عمومی فکر میں پرونے کی کوشش کی تو یقینا صدیوں سے فکری انجماد میں مقید مقلدین اسلام کی اکثریت کو انتہائی ناگوار گزری انہوں نے ڈاکٹر شریعتی کی اس آفاقی فکر پر توجہ دینے اور اس پر مزید سوچ و فکر کرنے کے بجائے ان کے نظریات کو اتہام و الزام کے فیکٹری کا حصہ بنایا۔ کسی بھی علمی سوچ اور تحقیقی فائنڈنگز پر اعتراض کیا جاسکتا ہے لیکن سوچنے اور غور و فکر کرنے سے منع نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شریعتی کی نظریات کو پرکھنے اور اس کا جائزہ لینا اور پھر اس کا اقرار وانکار کرنا موجودہ فکری جمود کے دور میں انتہائی ضروری ہے۔ اسی سوچ کے مطابق مقالہ ہذا کو تحریر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر شریعتی ایک ہمہ گیر شخصیت ہے اس لئے مختلف جہتوں سے اس پر کام ہو سکتا ہے میں نے بہت غور و خوض اور ان کی کتب کے مطالعہ سے جس چیز سے سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ اس کی تصور امامت و خلافت کی ایک نئی تفہیم ہے جس میں ایک آفاقی جہت کے ساتھ نظریہ امامت و خلافت کو پیش کیا ہے۔ اس میں بہت حد تک جدت پسندی بھی ہے وہی پر کافی دقیق نقاط بھی ہیں جو قابل اعتراض و تنقید بھی ہیں۔

نقطہ اول: امامت و خلافت طبقاتی سوچ کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی

ڈاکٹر علی شریعتی نے مسئلہ امامت و خلافت کو جن زاویوں سے سمجھا اور لکھا اس طرح امامت کو طول تاریخ میں نہیں سمجھا گیا اور نہ لکھا گیا۔ یقینا مسلمانوں میں امامت کی تاریخ رحلت نبوی ﷺ کے فوراً بعد اور سقیفہ کے جرگے کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی۔ سقیفہ کے واقعہ کی اثبات اور انکار پر ہزاروں کتب طول تاریخ اسلام میں تحریر کی گئی ہیں اور مختلف جہتوں سے چند (تاریخی و فلسفی) معدودے دلائل کو عداوت اور تقدس کے زایوں سے لکھا گیا ہے۔ لیکن پہلی مرتبہ ڈاکٹر شریعتی نے اس کو رسمی دلائل سے ہٹ کر سماجیات کے زاویے سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ یقینا دین کا اصل تعلق انسانیت سے ہے تو اس لئے سماجیات کو دین سے جدا

کر کے نہیں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شریعتی کے نزدیک سقیفہ کا پس منظر طبقاتی نظام تھا جو اس سے پہلے عرب میں رائج تھا، دولت اور خاندانی پس منظر میں قبیلوں پر حکومتیں قائم ہوتی تھی۔ سرمایہ دار اور اشرافیہ کے سامنے کوئی فکر اور نظریہ قابل عمل ہو کر آجائے تو ابتدائی مراحل میں انتہائی سختی سے اس کی نہ صرف نفی کرتے ہیں بلکہ ان کے روک تھام اور سدو باب کیلئے ہر طرح کا اقدام اٹھاتے ہیں یہی سب کچھ آج کی دنیا میں ہوتا ہے اور یہی سب کچھ پیغمبر خدا کے دور میں بھی ہوتا رہا۔ سرمایہ دارنہ اور طبقاتی سوچ کے حاملین کو جب یہ نظر آتا ہے کہ ان کی مخالفت کے باجود عوام میں اس کی قبولیت بڑھ جاتی ہے تو اپنے سرمایہ دارانہ اور اشرافیانہ فکر کو نئے نظریہ اور فکر سے بھی ہم آہنگ کرتے ہیں۔ "پیغمبر اسلام ﷺ کی تحریک کے آغاز اور جزیرہ نمائے عرب میں پہلی اسلامی طاقت اور پہلے سماجی نطفہ کی تشکیل کے بعد قبائلی طاقتیں اور اشرافی طبقے بھی بحالت مجبوری اسلام کا رخ کرتے ہیں یعنی تسلیم بہ اسلام ہوتے ہیں تاکہ اپنی طبقاتی اور اشرافی قوت کی جدید اشرافی مخالت اور طبقاتی مخالف نظام میں محفوظ کریں۔"[i] انسانی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ سرمایہ دار اور اشرافیہ نے اقتدار میں رہے اور معاشرہ طبقات میں منقسم رہے تاکہ ان کی طبقاتی رہبری اور رہزنی جاری و ساری رہ سکے۔ ڈاکٹر شریعتی کی تفہیم کے مطابق اشرافیہ طبقہ اپنے ہدف کے حصول کے لئے انتہائی دلکش انداز میں عوامی سوچ و فکر کے حامل بن جاتے ہیں، ظاہری طور پر عوامی سوچ و فکر کو پروان چڑاتے ہیں ان میں اپنی کوئی الٰہی سوچ و فکر کا عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ ان میں ان کی اپنی فکر صرف سرمایہ دارانہ ہوتی ہے ان ہی سرمایہ دارانہ مقاصد کے حصول کے لئے کیلئے اسی حکومت اور مذہب کو اختیار کرتے ہیں جو عوامی اور عمومی ہو۔ شروع اسلام کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہوا کہ اشرافیہ اور سرمایہ دار لوگ داخل اسلام ہوئے اور اس آفاقی و عالمگیر دین کو طبقاتی روش میں تبدیل کیا۔ جیسے کہ آپ لکھتے ہیں "بہت سے قبائلی اشراف اپنی اسی طبقاتی اور اشرافی خصوصیات کے ساتھ داخل اسلام ہوئے اور اسلام کی طاقت کا حصہ بنے۔ ان میں ابوسفیان اور قریش وہ افراد شام تھے کہ جب رسول خدا وارد مکہ ہوئے تو ان لوگوں نے بحالت مجبوری اسلام قبول کیا۔"[ii] قریش کے متعدد لوگ داخل اسلام ہوئے لیکن ان کی فکر وہی سرمایہ دارنہ اور اشرافیہ تھی جس کا اظہار چاہتے نہ چاہتے مختلف مواقع پر کرتے تھے جس سے خود رسول اکرم ﷺ کو بڑی مشکل اور اذیت کا باعث ہوتی تھی۔ رحلت نبوی ﷺ کے بعد یہی سرمایہ دارانہ سوچ تھی جس نے سقیفہ میں اسی سوچ کو اختیار کیا کہ کس علاقے اور کس

خاندان سے ہونے پر کس کو کتنا مقام اور شرف حاصل ہے۔ اگر ان دلائل پر کبھی تنقیدانہ بحث و تحقیق ہو تو یہ بات باآسانی اجاگر ہو کر سامنے آئی گی کہ عالمگیر اور آفاقی دین کی خلافت اور امامت میں قوم و قبیلہ اور علاقہ کی بنیاد پر دلائل امامت قائم ہو جاتے ہیں۔ اور ان ہی دلائل پر امت اسلامیہ کی امامت و خلافت کی بناء رکھا جاتا ہے۔ جبکہ دین و حامل دین کا تعلق کسی خاص قبیلہ و علاقہ سے نہیں بلکہ " اے رسول! لوگوں سے کہہ دیں میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں"[iii] قرآنی حکم کے برعکس رحلت نبوی کے بعد امت و انسانیت کی رہنمائی اور رہبری میں آفاقی و عالمگیر اور خدائی احکامات کے بجائے طبقاتی فکر کو پیش کیا گیا۔ یہاں تک کہ آفاقی اور انسانی تکریم اور انسانیت کی فضیلت اور اہمیت کی دلائل کو رہبری و رہنمائی کی اہلیت پر زیر بحث ہی نہیں لایا گیا۔ خلافت و امامت کے مصادیق میں علم و دانش، تربیت و فکر کے خصائص کے بجائے دولت و علاقہ اور قبیلہ جیسے خصائص کو بنیاد بنایا گیا۔ یہ سب کچھ صرف سقیفہ میں نہیں ہوا بلکہ حضرت علی کے مقابلے میں ہر دفعہ ہوتا رہا اور آج تک ہو رہا ہے۔ آج دنیا کی مقتدران کی اقتدار میں آنے کے اسباب و علل پر گہرائی سے نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اکثر حکومتیں طبقاتی (نسل، علاقہ، قوم و ذات) یا دولت کے بدولت معرض وجود میں آتی ہیں۔ ڈکٹیٹر شپ، بادشاہت، جمہوریت وغیرہ سب اسی طبقاتی اور سرمایہ دارنہ فکر کی مختلف شکلیں ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے ساتھ ہی اسی طبقاتی اور سرمایہ دارنہ سوچ نظام امامت و خلافت کی شکل میں وارد ہوئی اور پھر چاہتے یا نہ چاہتے یہ جزء اسلام قرار پائی۔ یہاں تک امامت و خلافت میں وصایت، شورائیت، سب میں کسی انسان کو معترض ہونے کا حق نہیں ہے وہی حق و سچ ہے جو مقدیمین اسلام یا مہاجرین اسلام کا کہنا اور کرنا ہے، درحالانکہ یہ سوچ خود طبقاتی فکر کی حامل ہے لیکن دین اسلام کا جزء لاینفک بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سقیفہ کے بعد خلیفہ ثانی نے اپنے اختیارات کو استعمال میں لاتے ہوئے ایک چھ رکنی شورائی کمیٹی بنائی۔ شورائی کمیٹی بنانے کا اختیارات کہاں سے اور کیسے انہیں حاصل ہوئے تو یقیناً جو دلائل موجود ہیں ان پر غور کیا جائے تو درپردہ طبقاتی سوچ و فکر کا مجسمہ ہی ملے گا۔ دوسری طرف جن چھ افراد کی کمیٹی بنائی گئی تھی ان میں سرمایہ دار ہی کو یہی حق حاصل ہوا کہ وہ اس کمیٹی کا ممبر منتخب ہوئے۔ حضرت علی بھی ایک اہم اور مشہور قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے البتہ سرمایہ دارنہ سوچ کے برخلاف الٰہی سوچ و فکر کے حامل تھے، سرمایہ دارنہ سوچ اس سے بخوبی واقف تھی تب ہی تو کمیٹی میں آپ کا کردار کو محدود کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شریعتی کے مطابق شوریٰ خلافت ثانی میں بھی طبقاتی

نقطہ نظر کو مقدم رکھا گیا۔ "اس شوریٰ کے چھ افراد پر مشتمل ارکان میں سے پانچ افراد میں سعد بن ابی وقاص، عبد الرحمٰن بن عوف، طلحہ، زبیر اور عثمان شامل ہیں۔ یہ پانچوں دور جاہلیت میں بھی اور اسلامی تحریک کے آغاز کے بعد بھی حاکم طبقہ سے وابستہ ہیں۔ پیغمبر خدا کے خالص ترین اور قریب ترین اصحاب میں سے کوئی بھی اس میں شوریٰ میں نہ شریک کیا گیا اور نہ اس نے خود چاہا ہے اسکی مثال میں ہم سلمان کو لاتے ہیں جو رسول خدا کے انتہائی عزیز القدر صحابی اور اہلبیت کے منظور نظر تھے۔ یہ وہ شخصیت اور نیز علمی اعتبار سے بے نظیر ہے لیکن انہیں بھی حق حاصل نہیں یا وہ نہیں چاہتے کہ سقیفہ، بعد سقیفہ اور شوریٰ خلافت میں ان کا کوئی پارٹ ہو یا پھر ابوذر جن کی رسول خدا ﷺ نے اتنی تعظیم و تجلیل کی ہے حتی کہ آپ انہیں ایک علمی مرجع اور عظیم ترین عالم کے عنوان سے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ابوذر نے اتنا کسب علم کیا ہے کہ ان کا سینہ اس ذخیرہ سے لبریز ہو گیا ہے۔ ان کا بھی خلفاء کے انتخابات میں کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ایک عام کی حیثیت سے بھی ان کو اپنی مشورت میں نہیں لیا گیا ہے۔ (جبکہ جن پانچ افراد شوریت میں شامل ہیں) اگر میں ایک ایک کر کے ان پانچوں افراد کو طبقاتی نقطہ نظر سے پہچنوانا چاہوں تو آپ دیکھیں گے کہ ان سب کا تعلق سرمایہ دار اشراف طبقے سے ہے بلکہ اسلام کے بعد کے دور میں بھی یہی صورت رہی ہے۔ مثلاً خود حضرت عمر کہتے ہیں "عبد الرحمٰن بن عوف میں صرف ایک عیب ہے اور وہ یہ کہ وہ قارونِ امت ہیں۔" سعد بن ابی وقاص بنی زہر کے اشراف میں سے ہے۔ زبیر کے ایک ہزار غلام ہیں جو شب و روز کام کرتے سختیاں جھیلتے ہیں اور پھر اپنی مزدوری اور محنتانہ کو جناب زبیر کی مٹھی میں رکھتے ہیں۔ ان کی علی بن ابی طالب سے بھی رشتہ داری ہے لیکن اس کے باوجود ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ وہ طبقاتی اساس کو حتی اس دور میں بھی جبکہ اس کی اصالت قائم ہے توڑتے ہیں۔"[iv] ڈاکٹر شریعتی نے اس بات کو پہلی دفعہ شد و مد کے ساتھ اجاگر کیا کہ اسلام نظام خلافت اور حکومت میں بھی طبقاتی سوچ ہی کار فرما رہی اور تا امروز ہنوز جاری ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب کی قبولیت معاشرہ میں کما حقہ نہیں ہوئی یعنی معاشرہ نے حضرت علی کو جو اپنے زمانے میں سب اعلیٰ اور ارفع تھے اس کے باوجود جس طرح قبول کرنا چاہے تھا ویسے قبول نہیں کیا، مورخین اور متکلمین نے اس کے مختلف وجوہات بیان کی ہیں لیکن شریعتی نے اس کی ایک وجہ یہی بیان کی کہ آپ کی سیاست و حکومت کا اساس ذات و پات اور علاقہ و دولت سے بلاتر انسانی تکریم کی بنیاد پر تھی جو اشرافیہ اور طبقاتی سوچ و فکر کے حاملین کیلئے قابل قبول نہیں تھی، یہ نقطہ بھی ذہین میں رہے کہ

عرب عوام کی اکثریت اسی طبقاتی اور اشرافی نظام کی ہی عادی تھی اور حاکم و محکوم ان کی سرزش میں تھی اسی لئے اکثریت اسی نظام کو یہی صحیح نظام سمجھ بھٹیں۔ بہت قلیل لوگوں کے علاوہ اکثریت کو اس نظام کے نقائض سے کماحقہ آگائی نہیں تھی۔ حضرت علی بن ابی طالب کی قبولیت ایسے نظام میں کیسے ممکن تھی۔ کیونکہ آپ کے آس پاس اور قریب ترین جو افراد تھے ان میں سے زیادہ کا تعلق نہ تو عرب کا اشرافیہ سے تھا اور نہ وہ سرمایہ دار تھے اور اگر کہیں ایسا تھا تو بھی ان کی معیار و مقدار پر حق امامت و خلافت کو نہیں جتاتے تھے۔ "علی کے طرفداروں میں سے ایک سلمان ہیں۔ فارس کی ایک بے خانماں ہستی کہ جو ایک یہودی کی غلامی میں تھے اور پھر عربوں نے انہیں خرید لیا تھا آزادی کے بعد انہوں نے محنت مزدوری کو اپنا پیشہ بنالیا تھا۔ دوسرے ابوذر غفاری ہیں کہ ان کا شمار مہاجرین میں ہوتا ہے اور نہ انصار میں، نہ وہ اشراف میں آتے ہیں اور نہ ان کا تعلق مدینہ کے بااصل نسب و قوم و قبیلہ سے ہے۔ ایک تنہا اور بیکس انسان ہیں جن کی آمد صحرا سے ہوئی اور جن کا بسیرا مسجد ہے۔ تیسرے میثم، ایک خرمافروش، جن کی اپنی کوئی دکان نہیں ہے بلکہ وہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر ایک تختہ پر کھجور بیچتے ہیں، یہ علی کے بہت بڑے صحابی ہیں اور اس سے پہلے رسول خدا ﷺ کے اصحاب میں ان کا یک اعلیٰ مقام رہا ہے۔ جناب رستمآب ﷺ کی رحلت کے بعد انہوں نے علی بنی ابی طالب سے اپنی وفاداری باقی رکھی۔ چوتھے عمار ہیں اور وہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے علی بنی ابی طالب سے اپنی وفاداری قائم رکھی۔ ان کی والدہ گرامی ہمیشہ حبش کی سیاہ فارم خاتون تھی اور اشراف مکہ سے تعلق رکھنے والے کسی گھرانے میں کنیز کی حیثیت سے رہتی تھی۔ ان کے والدہ کا تعلق نہ اشراف سے تھا اور نہ اوس و خزرج کی بڑی شخصیتوں سے۔ وہ ایک صحرائی آدمی تھے کہ جو مکہ کے اسی اشرافی گھرانے میں کہ جو اسی کے قوم و قبیلہ کے اتحادی تھے، مہمان بنے اور وہیں وہ سمیہ کے عشق میں مبتلا ہوئے اور پھٹ ان سے شادی کی اور یہی بات واضح کرتی ہے کہ ان کا طبقاتی مقام کیا تھا۔ پانچویں صہیب ہیں جن کا تعلق (عرب کے طبقات و اشراف سے نہیں بلکہ) یونان سے ہے۔"[v] ڈاکٹر شریعتی نے اس بات کو بڑی شدّ و مد کے ساتھ بیان کی ہے اسلام کے ظہور اور اس کی تنفیذ کے بعد اشرافیہ اور سرمایہ داروں نے اسلام کو قبول کیا اور یہی فکر بعد از رحلت نبوی ﷺ بھی نظام اسلام میں رائج رہا جو تاحال ٹکراؤں کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ اس بات میں بہت وزن ہے کہ رحلت نبوی ﷺ کے ساتھ اسی اشرافیہ اور سرمایہ دار نہ فکر اسلامی نظام خلافت میں حاوی ہوئی۔ اس کے بعد چودہ

سالوں سے بعنوان امامت و خلافت دور اول کے خلفاء (بالخصوص خلفاء راشدین) سے مسلمانوں کی عقیدت اور اظہار محبت مسلسل جاری و ساری ہے جس کی وجہ سے اس نظام کی اسلامائیزیشن زیادہ سے زیادہ ہوئی یہاں تک کہ اب مورخین کو حقائق کی بنیادوں پر بھی دور اول کے خلفاء پر تنقیدی جائزہ لینے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی کچھ علماء اہل سنت نے جسارت کی ہے اور اس سلسلے میں کتب تحریر کی ہیں جن میں دور حاضر میں سب سے اہم کتاب ابو العلیٰ مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" ہے۔ بہر حال رحلت نبوی ﷺ کے بعد ابتدائی تقریباً چالیس سالوں کو مورخین و متکلمین نے یہی لکھا ہے کہ یہ دور عین قرآن و سنت کے اصولوں کے مطابق تھا۔ اب اس دور کی عقیدت مسلمانوں میں اس طرح سے سج دج گی ہے کہ کسی کی کوئی مجال نہیں ہے کہ اس دور کے نقائص سامنے لائے اور اس پر تنقید کرے۔ اگر ڈاکٹر شریعتی نے ایک نئے زاویے سے انتہائی صحیح اور ناقابل انکار حقیقت (تنقید) پیش کی ہے تو یقیناً مسلمان اس تنقید کو کسی بھی صورت میں قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں گے لیکن ایک محقق کا یہی کام ہوتا ہے کہ جو حقیقت ہے اس کو تحریر کرے چاہے معاشرہ اس کو قبول کرے یا نہ کرے۔ اس لئے اس پر اگر ڈاکٹر شریعتی طبقاتی اور سرمایہ دارنہ نظام ہونے کے دلائل پیش کرے تو وہ کسی کیلئے بھی قابل قبول تو نہیں ہو سکتے ہیں لیکن غور و فکر کرنے کیلئے ایک راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر شریعتی کے نظریہ کی تائید اس بات پر بھی ہو جاتی ہے کہ خلافت و امامت کا سرمایہ دارنہ اور طبقاتی فکر رحلت نبوی ﷺ کے بعد رونما ہوئی تھی اس کے نتائج صرف بارہ سالوں کے اندر اندر سامنے آجاتے ہیں۔ "رسالتمآب ﷺ کے ٹھیک ۲۱ سال بعد بنی امیہ کی حکومت لوٹ آتی ہے اور پھر کسرائی شان و شوکت اور جاہ و جلال، قیصری بذل و بخشش، طبقاتی تضاد، بردہ خریدی اور بردہ فروشی اور استثمار و استبداد دسبھی کچھ رونما ہوتا ہے۔ درپردہ اشرافی طبقہ پھر نئے سرے سے ظفریاب ہو گیا ہے۔"[vi] جب حضرت علی کی حکومت محدود پیمانے پر قائم ہو جاتی ہے تو پیغمبر اکرم ﷺ کی رسالت و نبوت ﷺ کے دور میں اہلیت و خلوص کی بنیاد پر جن لوگوں کو مقام مرتبہ ملا تھا وہ دوبارہ واپس آجاتا ہے۔ جس میں امیر و غریب، ذات و قبیلہ اور قوم و علاقہ کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ جس میں حبش کے غلام ہو، عرب کا پھل فروش ایک عام مزدور ہو، عجم کا ایک مسافر ہو یا عرب کے سرمایہ دار ہو کعب الاحبار یا قبیلہ کے سردار ابو سفیان سب میں کوئی تمیز و فرق نہیں بلکہ اہلیت و صلاحیت اور خلوص کے بنادوں پر افضلیت معنون ہو جاتی ہے۔ یہ آفاقی فکر سرمایہ دار اور

طبقاتی برتری کے حاملین کے لئے کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہے یہی وجہ کہ وہ سرمایہ دار نہ سوچ جو قبل از اسلام معاشرہ میں نافذ تھی وہ پھر سے اپنے خول سے باہر آجاتی ہے اور امام انس و جن حضرت علی بن ابی طالب کو معاشرے میں سب سے بدتر بلکہ واجب القتل گردانا جاتا ہے تقریباً ایک صدی تک مساجد سے لعنت بھیجنا سرمایہ داروں کا ایک پسندیدہ نعرہ بن جاتا ہے لیکن اس کو اسلامی کے دائرے میں پرو کر مساجد سے اس کا اعلانات کرایا جاتا ہے یعنی سرمایہ داروں کا دین یہ ہے کہ وہ علی و اولاد علی پر لعنت بھیجنا اور قتل کرنا شرعی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اب دین اسلام کی ظاہری و عملی شکل آفاقی و عالمگیر نہیں رہا تھی بلکہ طبقاتی نظام کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ جس میں محروم اور پسماندہ لوگوں کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی اور نہ ہی عالمگیر اور آفاقی فکر کے حاملین کیلئے کوئی گنجائش تھی۔ یہی وہ وجوہات ہیں جس کی وجہ سے جب حضرت علی بن ابی طالب خلافت پر آجاتے ہیں تو یہی سرمایہ دار طبقہ آپ کے خلاف میدان جنگ میں اتر آتا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت علی بن ابی طالب کے دور خلافت میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کا قتل ہو جاتا ہے اور یہ قتل اسلام اور غیر اسلام کے درمیان نہیں بلکہ طبقاتی اسلام اور عالمگیر اسلام کے درمیان لڑائیوں کا نتیجہ ہے۔ تین جنگوں (جمل، صفین، نہروان) اور بعد میں امیر شام کے ہاتھوں تیس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کا قتل یوں کم و پیش ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کا قتل ہوا جس کی بنیاد کفر و اسلام نہیں بلکہ طبقاتی اسلام کا ٹکراؤں عالمگیر اور آفاقی اسلام سے تھا۔

نقطہ ثانی: امامت و خلافت امارت ورھبریت سے مشروط نہیں

مسلمانوں میں نظریہ خلافت کا جو نظریہ وجود میں آتا ہے اس کا تعلق امارت و حکومت سے مربوط اور مشروط ہو جاتا ہے جبکہ ڈاکٹر شریعتی اس نظریہ امامت کو الٰہی امامت اور خلافت سے تعبیر دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک الٰہی امامت دنیاوی امارت و حکومت سے بالاتر ہے اور یہ الٰہی امامت نہ وصایت اور نہ شوریت سے ثابت ہوتی ہے بلکہ ان کی تعین کیلئے وصایت و شورایت وغیرہ سے نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ وصایت (نص) اور شورایت وغیرہ سے اس کی تشخیص کی جاسکتی ہے۔ امامت کا تعین ہونا اور شئ ہے اور اس کی پہچان اور تشخیص ہونا اور شئ ہے۔ ڈاکٹر شریعتی کا یہ نظریہ (امامت کا تعین نص یا شورایت سے نہیں ہو سکتا ہے) امامت و خلافت کا جو مورثی نظریہ اہل تسنن اور اہل تشیع میں پایا جاتا ہے دونوں کے برعکس ہے۔ کیونکہ اہل تسنن اس امامت و خلافت کو شوریت اور اہل تشیع وصایت سے ثابت کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں بہت حد تک

مماثلت پائی جاتی ہے۔ مذکورہ دونوں صورتوں میں امارت اور حکومت یا رہبریت امامت کا حصہ قرار پاتی ہے۔ البتہ شیعیت میں ولایت و امامت و امارت کی حیثیت سے امامت کو قبول کرنا واجب اور لازم ہے لیکن اگر قبولیت مردمی نہ ہو تو پھر بھی امامت و خلافت الٰہی کی ولایت باقی و ثابت رہتی ہے۔ جبکہ اہل تسنن میں امارت و خلافت کا مفہوم ہی امارت و حکومت ہے۔ ڈاکٹر شریعتی کے نزدیک دونوں صورتوں میں الٰہی ولایت ثابت نہیں ہو سکتی ہے۔ امامت الٰہی کا تعلق نمائندگی اور حجت اور دلیل الٰہی کی حد میں اعلیٰ و ارفع مقام میں جہاں سے کائنات کا وجود باقی و جاری رہے۔ تاریخ انسانیت میں حضرت آدم سے خاتم تک کسی نبی کی حکومت و امارت پوری دنیا میں یکساں نافذ نہیں رہی ہے جبکہ انبیاء کی بعثت پوری دنیا کیلئے ہوتی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے صرف چند سال ایک محدود علاقہ (یثرب) میں حکومت قائم کی ہے یہ حکومت دنیا بلکہ کائنات کیلئے دلیل و حجت نہیں ہو سکتی ہے اور نہ پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی دنیا کے سامنے اپنی حکومت و امارت جو مدینہ میں قائم ہوئی تھی اس کو پیش کیا بلکہ اس حکومت کے حدود اربعہ کا تعین کر کے اس کو محدود کیا کیونکہ وہ ایک علاقے کی ضرورت کے تحت تھی اس کے برعکس دنیا کے سامنے آپ ﷺ نے عالمگیر و آفاقی انسانی اصولوں کو پیش کیا جس میں طبقاتی اور سرمایہ دارنہ تفاودات نہیں بلکہ انسانی عظمت اور دنیاوی و اخروی نجات کا راستہ متعین کیا باقی رہی بات حکومتوں کا قیام کا تو آپ ﷺ نے دنیا کے سامنے اسلام کی آفاقیت کو تسلیم کرنے کی دعوت دی۔ جو ہر طرح کی علاقائی رنگ و ذات سے بالاتر ہو کر انسانی اقدار کو مشتمل ہو۔ یہاں تک ان اقدار اسلام کو قبول کرنے والے متعدد حکمرانوں کو ان کی امارت میں باقی رہنے کا احکامات بھی صادر فرمائے۔ اس لئے دنیا کو حجت خدا (بنوت، امامت، خلافت) کی شکل میں قبول کرنا ہے۔ ڈاکٹر شریعتی کا یہ کہنا کہ امامت و خلافت رہبریت و حکومت کی محتاج نہیں ہے بلکہ یہ الٰہی منصب ہے جس کا تقاضا یہی ہے کہ لوگ امام کی امامت و رہبریت کو قبول کرے۔ ان کی موجودگی میں کسی اور کی رہبریت کو قبول کرنا شیعی نقطہ نگاہ سے بالکل صحیح نہیں ہے جس طرح ایک نبی کے موجودگی میں کسی اور کی حکومت کو قبول کرنا اہل تسنن اور اہل تشیع دونوں کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ لیکن انبیاء میں ایسے بہت سارے واقعات موجود ہیں کہ لوگوں نے نبی کے ہوتے ہوئے اپنی حکومتیں قائم کی۔ لہذا جس طرح نبوت کے وجود کے کیلئے حکومت و رہبریت ضروری نہیں اسی طرح امامت کے وجود کیلئے حکومت

ضروری اور لازمی حصہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی نے اس (حکومت) کو جوتوں کے تسمیہ سے تشبیہ دے کر اس کی انتہائی تضحیک کی[vii] اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حکومت اور امارت و رھبریت نہ کی جائے بلکہ اس کا مفہوم یہی ہے کہ حکومت و رھبریت نفاذ دین و شریعت کیلئے ایک ضروری جزء ہے نہ خود امامت کیلئے حکومت و رہبریت ضروری ہے۔ البتہ انسانیت کو اسی الٰہی نمائندے کی طرف رجوع کرنا لازمی ہے تاکہ ایک الٰہی معاشرہ کا قیام ممکن ہو سکے۔ لیکن حکومت الٰہی نمائندے سے ہٹ کر کسی اور کے ہاتھ میں آجائے تو اس کی اہمیت جوتے کے تسمیہ سے بھی بدتر ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب نے ایک اور خطبہ[viii] میں کہا کہ اگر معاشرہ سے ناانصافیوں کا خاتمہ اور حقداروں کو ان کا حق دلانا مقصود نہ ہوتا تو میں اس حکومت کو قبول نہ کرتا ہے اس سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت و امارت کسی بھی صورت میں امامت کے وقوع پذیر ہونے کیلئے ضروری نہیں ہیں تو دوسری طرف حکومت و امارت تنفیذ دین کیلئے امام کا مقدماتی حصہ بن جاتا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات اس طرف ہدایت کرتی ہیں کہ نبیوں کے بعثت کا ایک بنیادی وجہ معاشرہ میں عدل و انصاف کا قیام کرنا ہے۔ جیسے سورہ حدید میں ارشاد ہوتا ہے۔ "یقیناہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیاں دے کر بھیجا ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگوں میں انصاد قائم ہو"[ix] عدل و انصاف اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا قیام معاشرے میں بغیر حکومت و امارت کے کیسے ممکن ہے، یہ سب کچھ صرف اس وقت ممکن ہے جب معاشرہ کی رہبریت و امارت ہاتھ میں ہو۔ جس طرح نبی کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد معاشرہ کی اصلاح اور تنفیذ دین ہے اسی طرح امام کے منصوص کا ایک بنیادی مقصد ایک خدائی معاشرہ کے قیام ہے جس میں الٰہی احکامات کی تنفیذ ہو سکے۔ اسی تناظر میں امامت و خلافت کے وجود اثباتی لازم آتی ہے لیکن اس نقطہ میں ہی ڈاکٹر شریعتی اختلاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ امامت کا وجود اثباتی نظریہ امارت و حکومت کے سبب نہیں اور نہ ہی نص، وصایت یا شورایت ہے۔ بلکہ امامت نظام تکوینی کا ایک حصہ ہے۔ تنفیذ دین کیلئے رہبریت، حکومت و سیادت و قیادت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سب کچھ تشریعی بنیادوں پر معرض وجود میں آتے ہیں اس سے الٰہی امامت کا تشریعی رہبریت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ الٰہی امامت کو تشریعی بنیادوں پر لانے کے لئے الٰہی امامت کی تشخیص ضروری ہے۔ یعنی امامت کا تعین بذریعہ نص، وصایت اور شورایت نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ

دیگر صفات سے امام کو معین و مقرر کیا جاسکتا ہے یہ وظیفہ الٰہی اور نظام تکوینی کا حصہ ہے۔ امامت کے سلسلے میں جتنی بھی صفات بیان ہوتی ہے انسانیت کو ان صفات وخواص کے ذریعے اس تکوینی نظام امامت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے یعنی تشخیص امام کیلئے نص، وصایت اور شورایت یا دیگر خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔

نقطہ ثالث: امام کا تعین بذریعہ نص ووصایت سے نہیں کیا جاسکتا

امام کے تعین و تشخیص میں مسلمانوں میں بنیادی اختلاف موجود ہے۔ اہل تسنن امام و خلیفہ کا تعین و تشخیص انتخاب اور استصواب سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کا لازمہ انتخابات (الیکشن) یا مورثی طریقہ بن جاتا ہے لیکن دوسری طرف اہل تشیع امام و خلیفہ رسول کا تعین و تشخیص انتخاب یا استصواب کے بجائے وصایت اور نص سے کرتے ہیں۔ وصایت اور نص نہ تو الیکشن ہے اور نہ مورثی انتخاب ہے۔ بہر حال یہ دو طریقے یعنی اہل تسنن کے نزدیک الیکشن اور اہل تشیع کے نزدیک سلیکشن سے امامت کی تشخیص ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شریعتی امامت کے تعین اور تشخیص میں ان دونوں طریقوں کا انکاری ہے۔ ان کا نظریے میں یہ دونوں طریقے مورثی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "امام کا انتخاب نصب سے ہونا چاہیے یا انتخاب سے پھر وہ قبل کے پیغمبر یا امام کی طرف سے کینڈیڈیٹ بنے؟ میرے نظر سے تینوں کا جواب منفی ہے۔"[x] ڈاکٹر شریعتی اپنے اس نظریے کو ائمہ معصومین کی امامت کے تعین و تشخیص میں ان کی برتر و اعلیٰ صفات کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدائی صفات کا حامل جو ان صفات میں سب سے اعلیٰ و ارفع ہو کوئی اس کا مقابلے میں نہیں آسکتا ہے۔ امامت کوئی خارجی عامل نہیں جو انتصاب اور انتخاب یا استصواب سے انہیں حاصل ہو بلکہ یہ اندرونی (Inherit) شئے ہے۔ جیسے کہ لکھتے ہیں "امامت ذاتی حق ہے۔ جو ان کی ماہیت میں شامل ہے اور اس کا سرچشمہ خود امام ہیں۔ کوئی بیرونی عامل نہیں، نہ انتخاب ہے اور نہ انتصاب، خواہ وہ منصوب ہوں کہ نہ ہوں، لوگ انکا انتخاب کریں یا نہ کریں وہ امام ہیں، اس لئے کہ وہ ان فضائل کے حامل ہیں، خواہ وہ متوکل کی قید میں ہوں یا منبر رسول ﷺ پر، خواہ ساری امت ان کی بیعت کرے یا صرف سات آٹھ آدمی ان کے مقام اور ان کی منزلت کے شناساں ہوں۔"[xi]

ڈاکٹر شریعتی کا یہ نظریہ کا امامت کی تعین کرنا انسانیت کا وظیفہ نہیں ہے یہ ایک شیعی فکر و نظریہ ہے اس میں اتنا کوئی اختلاف نہیں لیکن یہ بات قابل غور و فکر اور باعث اختلاف ہے کہ ایک تکوینی نظام کا حصہ

ہے۔ یہاں تک اس بات کو سمجھانے کیلئے ایک بکری کا، ایک پہاڑ کا اور دیگر مثالیں آپ نے پیش کی ہے۔ یہ سوچ و فکر شیعیت کے نظریہ امامت کے بالکل برعکس ہے۔ شیعیت کے نزدیک امامت نص و وصایت سے ثابت کرنا لازم ہے تاکہ دنیا کے سامنے اس کو اجاگر اور متعین کر سکے۔ یعنی "شیعہ اس کو کہا جائے گا جو یہ عقیدہ رکھے کہ امت کی سیادت اور قیادت کا حق رسول خدا کے بعد حضرت علی کو اور پھر ان کی اولاد کو حاصل ہے، جو حکم الٰہی سے ان کو اور ان کی اولاد کو ملا ہے، سوائے یہ کہ وحی کا نزول رسول خدا کیلئے مخصوص ہے۔ تمام مسلمان بھی اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ سلطنت دینی و زمانی کے اختیارات پیغمبر خدا ﷺ نے اپنے خلیفہ کو دیے تھے۔ اختلاف اس پر ہے کہ آیا یہ اختیارات ائمہ اہل بیت کیلئے آپ ﷺ نے مخصوص کیے تھے یا انھیں امت کے اختیار میں چھوڑا تھا۔ شیعہ اول الذکر نظریہ کے حامی ہیں۔ "ان الشیعۃ تتعین بالنص لا بالانتخاب، ای ان اللہ تعالیٰ یامر النبی ان یبلغ المسلمین بانّہ قد اختارَ (فلاناً) خلیفۃ بعدہ۔ وانّ علیھم ان یسمعوا لہ ویطعوا، وقد صدرَ ھذہ النص بالفعلِ منَ النبی علیٰ علیِ بن ابی طالبِ۔ ھذا ھو التشیع[xii] بے شک شیعہ نص کے قائل ہیں نہ کہ انتخاب کے، یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کو بتادیں کہ انہوں نے فلاں (علی بن ابی طالب) کو اپنے بعد کیلئے اپنا خلیفہ بنایا ہے، اور ان (لوگوں) پر واجب ہے کہ خلیفہ کا کہا مانیں اور اس کی پیروی کریں اور بے شک یہی نص خلافت حضرت علی کے لئے رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ سے ثابت ہوتی ہے۔ اسی نظریہ کے ماننے والے کو شیعہ کہا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر شریعتی کا نص، وصایت وغیرہ سے امام کا تعین کا انکار اور اس کو نظام تکوینی کا حصہ قرار دینا درحقیقت نظریہ امامت ایک تخیلانہ فکر بن جاتی ہے۔ امامت ائمہ معصومین بنیادی طور پر تکوینی ہونے کے ساتھ ساتھ تشریعی بھی ہے۔ اگر صرف یہ تکوینی نظام کا حصہ ہوتی تو پھر یقیناً انسانیت کیلئے حجت اور دلیل نہیں بن سکتی ہے۔ ایک عام انسان نظام تکوینی کی تشخیص کیلئے زیادہ جدوجہد نہیں کرتا ہے اور نہ اس کی ہر شئ کے حصول کیلئے کوشاں ہوتا ہے۔ نظام تکوینی میں کچھ اشیاء انسانیت کیلئے واضح اور بین ہیں تو وہی پر کچھ اشیاء مبہم اور غیر مرئی بھی ہیں۔ انسانیت کے ایک ایک فرد پر ان پورے نظام تکوینی کی معرفت حاصل کرنا اس کی ہر ایک مرئی اور غیر مرئی شئ کے بارے میں جاننا اور اس کے مطابق عمل کرنا ضروری نہیں ہے اگر امامت کا تعین نہ بلکہ

نظام تکوینی کا حصہ قرار دے کر چھوڑ دیا جائے تو پھر یہ امامت مبہم اور غیر مرئی بھی ہو سکتی ہے اسلئے بحکم خدا امامت کو بذریعہ نص ووصایت سے متعین کیا گیا تا کہ پوری انسانیت کے ایک ایک فرد کیلئے یہ حجت اور دلیل بن سکے۔ میرے نزدیک اگر نص و وصایت کو امامت سے الگ کر دیا جائے تو پھر شیعیت ہی باقی نہیں رہ جاتی ہے کیونکہ امامت کا تعین و تشخیص نص ووصایت سے ہونا ہی شیعیت ہے۔ اس سلسلے میں راقم نے ایک تحقیقی کتاب ''نص امامت'' تحریر کی ہے۔ جو پاکستان میں دستیاب بھی ہے۔ بہر حال اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ شیعہ اپنے ائمہ کی امامت کو من جانب اللہ تصور کرتے ہیں اوران کے عقیدے کے مطابق اس کا اعلان بحکم خدا رسول یاامام اپنے بعد کے امام کے بارے میں کرتا ہے۔ اس تعینی کو نص کا نام دیا جاتا ہے۔ سعد بن عبد اللہ ابی خلف الاشعری القمی نص کی اصطلاحی تعریف اس طرح کرتے ہیں ''النصّ: فی اصطلاح اھل العلم ھو اللفظ الدال علی معنی غیر محتمل للنقیض بحسب الفھم و الاثر ماجاء عن النبی و الامام او یکون الامام او عن الصحابی و التابعی من قول او فعل، و عند الشیعۃ الامامیۃ یجب ای یکون الامام منصوصاًعلیہ عن النبی لانَّ العصمۃ من الامور الباطنیۃ التی لا یعلمھا الاّ اللہ ثم فلابدّ من نص من یعلم عصمتہ علیہ او ظھور معجزۃ علی یدہ تدّل علی صدقہ والامام عندھم ھو علی بن ابی طالب بالنص المتواتر علیہ من اللہ و رسولہ ثم بعدہ ولدہ من صلبہ الائمۃ المعصومون حتی محمّد بن الحسن صاحب الزمان صلوات اللہ علیھم بنص کل سابق منھم علی لاحقہ۔ اہل علم کی اصطلاح میں نص وہ لفظ ہے، جو کسی معنی پر دلالت کرتا ہو، جس پر نقیض کا احتمال نہ ہو اور یہی مفہوم اور اثر سمجھ میں آتا ہے جو کچھ نبی اور امام سے وارد ہوا ہے۔ امام، صحابی اور تابعی کے قول و فعل سے بھی یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور شیعہ امامیہ کے نزدیک واجب ہے کہ امام پر رسول سے نص ہو۔ اس لئے عصمت ائمہ باطنی (شرائط) میں سے ہے، جس کو اللہ کے سواء کوئی اور نہیں جانتا۔ پھر لازم ہے کہ نص وہ کرے جو منصوص کی عصمت سے واقف ہو، یا وہ کرے جو اپنی صداقت میں معجزہ دکھا سکتا ہو۔ پس ان (شیعہ) کے نزدیک حضرت علی پر اللہ اور اس کے رسول سے نص متواتر ہے۔ حضرت علی کے بعد آپ کے صلب سے ائمہ معصومین بھی پیدا ہوئے یہاں تک کہ محمد بن حسن صاحب الزمان تک سابقہ (ائمہ) سے نص پہنچ جاتی ہے۔''[xiii] ''امامت کا تعین خدا کا معاملہ ہے اس کی تشخیص کرنا انسانی وظیفہ ہے'' یہ کہنا تو بہت آسان اور پرکشش ہے لیکن اس کے نتائج بیانک اور خطرناک ہیں۔ شریعتی

کے مطابق ایک طرف تو امامت ایک تکوینی مسئلہ ہے تو دوسری طرف اس کے ادراک و تشخیص کرنے کا قائل نظر آتے ہیں لیکن اس کیلئے نص، توقیف اور وصایت کے ذرائع کا منکر نظر آتے ہیں اگر اس کو مان بھی لیا جائے تو پھر اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ امامت کی تشخیص کرنا ایک تشریعی اور اجتہادی مسئلہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ ہر وہ مسئلہ جو تکوینی سے تشریعی میں تبدیل ہو جائے تو اس میں نص اور توقیف ہو تو وہ یقینی اور لازمی ہوتا ہے پھر اس کے وجود و عدم وجود پر بحث و اجتہاد نہیں ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر شریعتی کے اس نظریہ کو قبول کرنے کی صورت میں یہ تو نظریہ امامت ایک خالصتاً نظام تکوینی کا حصہ بن کر انسانیت کیلئے واضح اور یقینی حجت اور اسوہ نہیں بن سکتا ہے اور اگر اس نظام تشریعی میں لیا جائے تو نص و توقیف سے انکار کرتا ہے جس سے یہ ایک اجتہادی مسئلہ بن جاتا ہے جس سے امامت کی حجتیت باقی نہیں رہ سکتی ہے۔ لہذا امامت کا تعین نص، توقیف اور وصایت سے ہونا یقینی امر ہے تاکہ ولایت و امامت کے الٰہی نمائندوں کا یقینی تعین ہو تاکہ انسانیت ان کی اتباع و اطاعت سے دنیا و آخرت میں نجات حاصل کر سکے۔ یہاں تک رہی بات خلافت و امامت کا تعین کرنے کی تو یہ بات خود قرآن مجید سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو واضح طور پر ناموں کے ساتھ معین و مشخص کیا تھا اسی طرح سے پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب اور ان کے بعد ان کے نائبین کا ناموں سے تعین کیا تھا اسی تعینی کا نام نص ہے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب "نص امامت" میں لکھا ہے "شیعہ ائمہ اہل بیت کو خلفاء رسول ثابت کرنے کیلئے جو عقلی اور نقلی دلائل پیش کرتے ہیں ان دلائل کیلئے نص کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ نص کا مترادف نصب، توقیف، وصیت وغیرہ کی اصطلاحات بھی شیعیت میں استعمال کی جاتی ہیں۔"[xiv]

خلاصہ بحث ہے کہ ائمہ معصومین کی امامت کا تعین کرنے کیلئے جو واضح و بین دلائل قرآن و حدیث میں ہیں ان دلائل کو نص کہا جاتا ہے۔ اگر نص، وصایت، توقیف نہ ہو تو یقیناً امامت ایک مبہم ہونے کے علاوہ اس کی حجیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ امامت کیلئے نص دراصل حکم الٰہی کا دوسرا نام ہے، جس کا اعلان پیغمبر خدا ﷺ نے آخری ذلحجہ کے موقعہ پر غدیر خم میں حضرت علی کی امامت سے کیا ہے۔ پھر دیگر ائمہ معصومین یکے بعد دیگرے اپنے بعد کے امام پر نص کرتے رہے ہیں۔ پیغمبر خدا کی مشہور حدیث "من مات ولم یعرف

امام زمانہ مات میتۃ جاھیلیۃ"[xv] امام کی معرفت انسانیت پر لازم اور ضروری عقلی طور پر صرف اس وقت ممکن ہے جب اللہ کی طرف امام متعین اور مشخص ہو جائے۔

حوالہ جات

i شریعتی، علی، تشیع دین محمدی کے آئینہ میں، ص ۵۴۱، ترجمہ سید محمد موسیٰ رضوی، ادارہ ن والقلم، اشاعت 2002ء

ii تشیع دین محمدی کے آئینہ میں، ص146

iii القرآن، سورہ اعراف آیت نمبر158

iv تشیع دین محمدی کے آئینہ میں، ص148۔149

v ایضاً، ص151،150

vi ایضاً، ص155

vii نہج البلاغہ، خطبہ شقشقیہ

viii ایضاً

ix القرآن، سورہ حدید آیت25

x شریعتی، علی، امت اور امامت ص145، ترجمہ سید محمد موسیٰ رضوی، ادارہ ن والقلم، اشاعت ۵۰۰۲ء

xi امت اور امامت ص156

xii جواد مغنیہ، الشیعہ فی المیزان، ص15، نشر دار التعارف للمطبوعات، سال نشر1399ھ بیروت

xiii الاشعری، سعد بن عبد اللہ ابی خلف، المقالات والفرق ص140، مرکز انتشارات و فرہنگی، ایران چاپ دوم1360ھ

xiv استوری، سجاد علی، نص امامت ص115،114 ، اسلامک پبلی کیشنز پاکستان، جیوانی گارڈن کراچی، تاریخ اشات2012ء

xv ینابع المودہ ج۳، ص372، مسند احمد ج۴، ص96